کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ دونوں ہی غلط نتائج اخذ کرتے ہیں۔

موافقین بھی نظریہ ہی کے گن گاتے ہیں۔ اور نہیں دیکھتے۔ کہ جس انجیل کو مارکس نے پیش کیا تھا۔ کیا وہ صحیح ثابت ہوئی۔ اور جس جنت ارضی کا۔ دنیا بھر کے مظلوموں سے وعدہ کیا گیا تھا کیا وہ سچا ثابت ہوا۔ حالانکہ یہی چیز اصل میں دیکھنے کی ہے۔ اس اعتراف میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں۔ کہ اشتراکی قیادت نے ایک ملک کی حیثیت سے روس کو بہت بڑھایا۔ اور ترقی دی ہے۔ اور انہیں کی محنت، قابلیت اور بے پناہ جدوجہد کا فیض ہے۔ کہ جس کی وجہ سے اس نے چند ہی سالوں میں صنعت و حرفت اور پیداوار کے اعتبار سے مغرب کا تنہا حریف ہونے کا افتخار حاصل کر لیا ہے۔ اور علوم و افکار میں بھی کسی طرح اس سے پیچھے نہیں۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ نظریہ اور نصب العین کے اعتبار سے کیا یہ تجربہ کامیاب رہا اور کارل مارکس کے الہامات درست نکلے۔ کیا روس میں ایسا معاشرہ تشکیل پا گیا ہے جس میں اونچ نیچ نہ ہو۔ اور حاکم و محکوم کے معیار زندگی میں۔ زمین و آسمان کا تفاوت نہ پایا جاتا ہو۔ کیا حکمرانوں اور محکوموں کو یکساں آسانیاں حاصل ہیں۔ کیا مزدور وہاں اظہار رائے میں آزاد ہے اور آزادی سے اپنے آقاؤں کو منتخب کرتا ہے؟ اور کیا ان کی زیادتیوں کے خلاف، کوئی موثر آواز بلند کرنے پر وہ قادر ہے۔ اور کیا اس امر کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ کہ یہ اشتراکی معاشرہ کبھی جمہوری و انسانی اقدار کی طرف آزادانہ قدم بڑھا سکے گا۔

مخالفین کے انداز فکر میں بھی یہی غلطی کارفرما ہے۔ کہ وہ بھی صرف نظریاتی مفاسد ہی کو دیکھتے ہیں۔ اور اس کے مخصوص عقلیات ہی کو موضوع بحث ٹھہراتے ہیں! اور یہ نہیں ملاحظہ کرتے۔ کہ اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ اس الحاد و مادیت میں کچھ اخلاقی و انسانی اقدار بھی پنہاں ہیں۔ ورنہ اس دروغ کو یہ فروغ کیونکر حاصل ہوتا۔ اگر مارکس یہ آواز بلند نہ کرتا۔ اور مظلوم و بےکس طبقہ کی حمایت و نصرت میں آواز نہ اٹھاتا اور اس کے بعد اس کے بلند ہمت جانشین لینن اور سٹالین روس میں اشتراکیت کے لئے عملاً زمین ہموار کر کے دکھا نہ دیتے۔ تو کیا مغرب کے کارخانہ داروں میں، مزدوروں کی فلاح و بہبود کا کوئی خیال ابھرتا۔ اور وہ ان مناسب اصلاحات کے نفاذ کو بطیب خاطر مان لیتے۔ جو انہیں کے حکماء و مصلحین نے تجویز کیں اور اپنے طرز عمل میں کوئی ایسی تبدیلی گوارا کرتے، جس سے کہ ان کی دولت کا ایک حصہ ان کے ہاتھ سے نکلتا ہو۔ اور مزدوروں کی مشکلات پر صرف ہوتا ہو اگر اشتراکیت پر اس زاویہ نگاہ سے سوچئے گا کہ عملاً یہ کیا ہے، اور اس کے نتیجے میں کیا حقیقی انقلاب رونما ہوا ہے۔ تو آپ کو اس کے مقابلہ میں اسلام کا موقف سمجھنے میں کوئی بھی زحمت نہ ہوگی۔

مسلمان کسی نظریہ کے خلاف کسی طرح کے تعصب کو دل میں نہیں پالتا۔ اور کسی خیال کی محض اس بنا پر مخالفت نہیں کرتا۔ کہ یہ کس کیمپ کی طرف سے آیا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ یہ انکار خدا ایسے ملحدانہ عقیدہ کو ہرگز نہیں مان سکتا۔ اور مادیت تاریخ اور جدلیت پر اس کا مطلق ایمان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک تاریخ ایمان کے سراسر تابع ہے۔ متبوع نہیں۔ اور سیرت کردار کی ادنیٰ فرماں بردار ہے۔ مالک نہیں۔ نیز مسلمان تاریخ ہی کی روشنی میں یہ عقیدہ رکھنے میں حق بجانب ہیں۔ کہ مرد مومن اور صاحب کردار کی ایک ہی نگاہ سے اس کی تحول میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس کے دھارے مڑ سکتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے۔ کہ دنیا میں صرف طبقات ہی کی اقتصادی جنگ نہیں رہی بلکہ خیالات و افکار اور ایمان و کفر کی رزم آرائیاں بھی پائی گئی ہیں۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور انکے مخالفین کے طرز عمل سے ظاہر ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں اتنی وسعت ضرور ہے۔ اور اس کے مذہب میں اتنی گنجائش ہے۔ کہ اس میں جو خیر کے پہلو ہیں اور انسانیت سے ہمدردی اور خیر سگالی ہے اس کو اسی طرح اپنا سکے۔ جس طرح کہ خود ایک حد تک سرمایہ داری اپنانے پر مجبور ہوئی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات

اخلاقی تقاضے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ تقاضے وہ ہیں جو فرد سے کئے جاتے ہیں۔ اور کچھ حقوق و فرائض ایسے ہیں۔ جن کا تعلق جماعتوں کے باہمی روابط سے ہے جن تقاضوں کا مخاطب فرد ہے۔ ان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تقاضا یہ ہے کہ فرد اپنی انفرادی زندگی کو کس طرح عقل و عدل کے مطابق ڈھالے اور دوسرا تقاضا یہ ہے۔ کہ ایک ہی جماعت کے افراد اپنے باہمی روابط کو کس طرح حقوق و فرائض کے تعین سے منضبط کریں۔ فرد محض بحیثیتِ فرد ایک تجریدی یا مجازی تصور ہے انسان ایک جماعتی حیوان ہے۔ اس کی زندگی اور اس کی نفسیات کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں۔ جو جماعت کے روابط سے بالکل بے تعلق ہو۔ سوال یہ ہے کہ جماعت کا قیام کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جماعت کی ابتدائی وحدت، والدین اور اولاد کی باہمی فطری اور حیوانی محبت سے شروع ہوئی۔ انسان کا بچہ ایک طویل عرصہ تک ایسا کمزور اور بے بس ہوتا ہے۔ کہ اگر والدین تن اور من سے اس کی پرورش نہ کریں تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسلئے فطرت نے انسان کے اندر دو قوی جبلتیں پیدا کی ہیں۔ ایک اپنی ذات کی حفاظت اور بقا ہے۔ اور دوسری جبلتِ بقائے نسل ہے فطرت نے تمام جانداروں میں جذبۂ جنسی کو بقائے نسل کی خاطر نہایت درجہ قوت عطا کی ہے۔ اس جذبے کا مقصود اولاد کی پیدائش ہے۔ جو نوع کو قائم رکھتی ہے اس عالمی وحدت میں ابھی کوئی اخلاقی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ یہاں صرف جذبہ جبلت اور محبت ہے جس کے اندر کوئی داخلی تضاد اور پیکار نہیں۔

ماں کو بچے کی پیدائش اور پرورش میں جو مصیبت جھیلنی پڑتی ہے اس کو برداشت کرنے کے لئے کسی احساسِ فرض کی ضرورت نہیں۔ یہاں پر خارجی دباؤ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس لئے مذہبی اخلاقیات میں بھی آپ دیکھتے ہیں کہ اولاد کو بار بار تلقین کیجاتی ہے کہ والدین سے اچھا سلوک کریں، فرض شناسی اور احسان سے کام لیں لیکن کہیں یہ تلقین نہیں ملتی کہ اے انسانو اپنی اولاد سے محبت کرو یا اس کے ساتھ احسان اور عدل برتو۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک اخلاقی اور دینی تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔ اس لئے فطرت نے اولاد کے اندر والدین کے متعلق وہ قوی جذبہ ایثار و محبت نہیں رکھا۔ جو اس کو فرض شناسی سے مستغنی کردے۔ عمر رسیدہ والدین کا وجود بقائے نسل کے لئے ضروری نہیں رہتا۔ وہ پیکار حیات میں بھی کسی کام نہیں آتے۔ ان کے ساتھ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جانے والی اور اپنا رزق خود پیدا کرنے والی اولاد کی کوئی غرض وابستہ نہیں رہتی۔ ان کے ساتھ اولاد کا جو سلوک ہوگا وہ احسان شناسی یا فرض شناسی کی بدولت ہوگا۔ انسانی اخلاقیات وہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ جہاں کوئی فطری اور حیوانی جذبہ انسان کو اپنی انفرادی خود غرضی کی قربانی پر مجبور نہ کرتا ہو۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ اور دوسرے انسانوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا اس کی فطرت میں ہے۔

چنانچہ تمدن کی ابتدائی منازل میں پہلے ایک کنبہ پھیلتا ہوا اور بڑھتا ہوا ایک قبیلہ بن گیا۔ اور انسانی نفسیات اور اخلاقیات قبیلوی بن گئیں قبیلے کے اندر ہر فرد کا کام اور مقام ضرورت، اور رسم و رواج سے متعین تھا۔ انفرادی خواہش اور انفرادی رائے بروئے کار نہ آ سکتی تھیں قبیلوی زندگی کے اغراض و مقاصد معین تھے۔ خیر و شر کا معیار یہی تھا۔ کہ جس عقیدے یا جس طریق عمل کو قبیلہ اپنی بقا کے لئے لازمی سمجھتا تھا۔ وہ خیر تھا۔ اور جسے ضرر رساں سمجھتا تھا۔ وہ شر تھا۔ ایسی صورت میں عدل کا کوئی اور مفہوم اس کے سوا نہ تھا کہ افراد قبیلہ اپنے باہمی روابط میں سختی کے ساتھ رسوم و رواج کی پابندی کریں۔ اکثر قدیم زبانوں میں اخلاق اور رسم و رواج کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا تھا۔ عدل یا رحم یا دیگر اخلاقی عناصر جو کچھ بھی تھے ان کا اطلاق قبیلے سے باہر دوسرے قبیلوں پر نہ ہوتا تھا قبیلے سے باہر کسی انسان کی جان اور مال کی حفاظت کا کوئی تصور نہ تھا۔

اس انداز حیات میں نوع انسان نے لاکھوں برس زندگی بسر کی ہے۔ اس لئے انسانی نفس کے تحت الشعور میں اجتماعی یا قبائلی انانیت بہت راسخ ہو گئی۔ کہیں کہیں قبائل ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک قوم بن گئے لیکن کسی قدر ترقی یافتہ تمدن میں ایک قوم کی وحدت میں بھی کامل یک آہنگی نہ تھی۔ شروع میں تو جنگوں میں دشمنوں کو یا دوران پیکار میں قتل کر دیا جاتا تھا یا زراعتی تمدن کے پیدا ہونے کے بعد جنگی قیدیوں کو مار ڈالنے کی بجائے غلام بنا کر کام لینا زیادہ مفید معلوم ہوا۔ اس لئے شہری زندگی میں آزاد انسانوں کے ساتھ ساتھ غلاموں کا بھی ایک ہجوم تھا۔ جن کے کوئی حقوق نہ تھے۔ زمانہ ماضی میں تمدن کی ترقی کے ساتھ زیادہ تر شاہی نظام حکومت پیدا ہوا لیکن کہیں جمہوریت کا بھی تجربہ کیا گیا۔ یونان کی شہری مملکتوں میں جمہوری نظام تھا لیکن جمہور کے معنی آزاد انسان تھے۔ یونان میں جب سقراط و افلاطون اور ارسطو عقل اور عدل کے بلند ترین تصورات پیش کر رہے تھے۔ اس وقت بھی شہری مملکت میں ہر آزاد انسان کے مقابلے میں تین غلام تھے جنہیں نہ انفرادی حقوق حاصل تھے اور نہ اجتماعی زندگی کی تنظیم اور آئین سازی میں ان کو کوئی دخل حاصل تھا۔ ان حکما کے مجوزہ عادلانہ نظام میں غلامی کو ایک فطری اور لابدی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ کے اصول کے مطابق ارسطو کہتا تھا کہ انسانی تمدن دست و بازو سے کام کرنے والوں کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور محنت و مزدوری اور صنعت و حرفت کے تمام کاموں کے لئے غلام ہی موزوں ہیں۔ اس لئے فطرت کثرت سے ایسے انسان پیدا کرتی ہے جن کے لئے غلامی ہی کی زندگی درست ہے۔ یہ اس جمہوریت کا حال تھا جس نے وہ اکابر حکما پیدا کئے جن کی اخلاقیات آج تک حکیمانہ اخلاقیات کا منبع شمار ہوتی ہے۔

جہاں جہاں شاہی نظام قائم ہوا۔ وہاں تمام اقتدار ایک فرد اور اس کے خدام و معاونین کے ہاتھوں میں تھا۔ بادشاہ کی مرضی خیر و شر کا معیار تھی۔ اس کے ساتھ وابستہ امرا اور جاگیرداروں کا طبقہ اپنا اقتدار اور معاشی مفاد قائم رکھنے کے لئے مملکت کی ایسی تنظیم کرتا تھا جس میں محنت کش رعایا کا کام فقط بے چون و چرا اطاعت اور دولت کی پیداوار تھا جس کا کثیر حصہ ناکردہ کار طبقے کے حصے میں آتا تھا۔ شاہی اور امرائی کے دوش بدوش مذہبی پیشواؤں اور پروہتوں کا طبقہ پیدا ہوا۔ جو اقتدار اور معاشی استحصال میں بادشاہوں اور امرا کا معاون اور ہر قسم کے مفاد میں ان کا شریک ہو گیا۔ دین اور اخلاقیات کا سرچشمہ یہی پروہت تھے جنہیں عدل عامہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انہوں نے جو تعلیم و تلقین کی۔ وہ اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے لئے تھی۔ بادشاہوں کے درمیان جنگیں کبریائی اور

عظمت کی خاطر ہوتی تھیں۔ یا دوسرے بادشاہوں اور اُن کی رعایا کا مال لوٹنے کے لئے۔ دونوں طرف معصوم غریبوں کی قربانی ہوتی تھی۔ جو شکست میں قتل ہوتے یا غلام بنائے جاتے تھے۔ اور فتح میں بھی جو کچھ حاصل ہوتا تھا وہ بادشاہ اور امراء کے ہاتھ آتا تھا ایک ہی ملک کے اندر اخلاقی اصول دو قسم کے ہوتے تھے۔ بادشاہ اور امرا کی اخلاقیات بے نوا محنت کشوں کی اخلاقیات سے الگ تھی۔ اس دوگونہ اخلاقیات کی تعلیم زمانہ حال میں حکیم المانوی نطشہ کے ہاں ملتی ہے۔ جو کہتا ہے۔ کہ اخلاقیات کی دو قسمیں ہیں۔ آقایانہ اخلاق اور غلامانہ اخلاق۔

گزشتہ دو تین ہزار سال میں بلند مذاہب اور پاکیزہ اخلاقی اصول انسانی تعلیم و تلقین کا جزو بن گئے۔ لیکن جہاں تک جماعتوں اور ملتوں کا باہمی تعلق ہے عملاً اخلاقی تعلیم مؤثر نہ ہوئی۔ اور نہ ہی دین انسان کو عملاً عدل عامہ کا پابند بنا سکا۔ جس کے مطابق ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ وہ اخلاق عالیہ برت سکے جو ایک جماعت کے اندر بعض افراد دوسرے افراد سے برتتے ہیں۔ دین کی بنا پر جو فرقے یا ملتیں بنیں اُن کے عقائد خواہ کچھ بھی ہوں وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئیں۔

تاریخ انسانی میں دین کے نام پر جو قتل و غارت ہوا ہے۔ وہ اور محرکات کے مقابلے میں کچھ کم نہیں۔ مغرب میں صلیبی جنگوں نے جو تباہی مچائی وہ انسانی ظلم و جہل کا ایک تاریک اور شرمناک باب ہے۔ مذہب کے نام پہ سب سے زیادہ ظلم حضرتِ مسیح کے بر خود غلط نام لیواؤں نے کیا۔ جب کچھ عرصہ کے لئے اسلامی دنیا سے اُن کا رخ پھرا تو وہ آپس میں الجھ گئے۔ اور مذہبی جنگوں نے فرنگ میں وہی کچھ کیا۔ جو تاتاریوں کی غارت گری نے مشرق میں کیا تھا۔

یہ سب مظالم اُن لوگوں کی طبیعت سے اُبھرے اور اس ملت کے ہاتھوں سے ہوئے جس کے مذہبی پیشوا کلیسا میں یہ وعظ کرتے تھے کہ تشدد کا جواب عفو سے دو۔ ایک گال پر طمانچہ مارنے والے کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ قبا چھیننے والے کو اپنا کرتا بھی حوالے کر دو۔ اور بیگار میں پکڑ کر ایک فرسنگ تک بوجھ اُٹھوانے والے کے ساتھ بخوشی دو فرسنگ چلے جاؤ۔

آخر کار یورپ مذہبی تنگ نظری اور تعصب اور مذہبی جنگوں سے ایسا عاجز آیا کہ مفکرین و مصلحین کا ایک گروہ مذہبی توہمات و تعصبات کے مقابلے میں عقلیت کی تعلیم دینے لگا۔ تمام اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں سائنس اور عقلیت نے مذہب کی جگہ لے لی۔ حکومتوں میں سے کلیسائی اقتدار رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔ اور یہ امید قوی ہوتی گئی کہ عقلیت کی ترقی کے ساتھ انسان عدل کوش بھی ہوتا جائے گا۔ مغرب میں غیر مذہبی علوم و فنون کی تعلیم عام ہو گئی۔ لیکن جماعتوں کے باہمی اخلاقی روابط ویسے ہی رہے جیسے کہ دورِ وحشت میں تھے۔ گزشتہ تین سو سال میں مغرب نے جہاں علم و فن میں ترقی کی وہاں قومیت کا جذبہ بھی روز افزوں ترقی کرتا رہا۔ یہ وہی ترقی یافتہ قبیلوی جذبہ تھا۔ جس نے اب ایک نئی اور زیادہ خوفناک صورت اختیار کر لی۔ مذہبی تنگ نظری کا ابھی پوری طرح خاتمہ نہ ہوا تھا کہ قومی تعصب اور خود غرضی نے بین الملل اخلاقیات کو تباہ کرنا شروع کیا۔ ماکیاویلی عصرِ جدید سے قبل ہی ایک صحیفۂ ابلیس تصنیف کر کر گیا تھا جس میں بڑے زور شور سے یہ تلقین تھی کہ انفرادی اخلاقیات کا اطلاق بین الملل روابط پر نہ ہوتا ہے اور نہ ہونا چاہیئے۔ مملکت کا فرض اپنے آپ کو مضبوط اور دوسری مملکتوں کو کمزور کرنا ہے۔ یہاں عدل اور رحم اور مساوات کا کوئی سوال نہیں۔ مملکت کا مقصود قوت اور اقتدار ہے اور اس کے حصول کے لئے جو ذرائع بھی ہوں وہ نہ صرف جائز بلکہ فرض ہیں۔ جو بادشاہ یا وزیرِ مملکت انفرادی

اخلاقیات کو جس کا تعلق ایک مملکت یا ملت کے افراد کے باہمی روابط سے ہے، مملکتوں کے باہمی تعلقات میں داخل کرے گا وہ شدید حماقت کا مرتکب ہوگا۔ اور اس حماقت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت تباہ ہو جائے گی۔ سیاست کو مذہب اور اخلاق سے بالکل الگ رکھنا چاہیئے۔

عصرِ جدید میں فرانس کے مشہور فلسفی برگساں نے اپنے آخری دورِ تفکر میں مذہب اور اخلاق پر ایک کتاب لکھی جس کے مرکزی مضامین میں سے ایک مضمون یہ ہے کہ آج تک عام طور پر نوعِ انسان کی اخلاقیات جماعتی اخلاقیات تک محدود رہی ہے۔ اس اخلاقیات کا دائرہ کنبے سے بڑھ کر قبیلے تک اور قبیلے سے قوم تک وسیع ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے اندر ابھی تک دوئی قائم ہے۔ کہ دو قوموں کے درمیان پوری طرح ایثار اور عدل کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فقط انبیا اور اولیا کی اخلاقیات میں ایک ہمہ گیر وسعت ہوتی ہے اور ایک نبی کا اخلاقی نظر و تاثر نسل یا قبیلے کے اندر محصور نہیں ہو سکتا۔ حقیقی روحانیت اور اصلی وجدانی حیات یہی ہے۔ لیکن کسی نبی کی تعلیم سے جو جماعت یا ملت معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس میں پھر تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور عقائد و اعمال و تعصبات اس کو پھر قبیلوی تعصب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ نبی کی اپنی وسعتِ قلب تا دیر پوری ملت میں سرایت نہیں کرتی

تاریخِ ادیان کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس نتیجے کو اخذ کرنے کے لئے کافی ہے۔ کہ دین انسانوں کو بلند اخلاقی اصول کی بنا پر متحد کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مولانا حالی نے سچ کہا ہے:-

فسادِ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے + یہ جنگ وہ ہے کہ صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

حضرت مسیحؑ کی تلقین کہ دشمن سے بھی محبت کرو، اور اسلام کی لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین کی تعلیم کہ دین کی بنا پر مختلف ادیان کے پیرووں پر کوئی جبر روا نہیں، بہت جلد فراموش ہو گئی۔ نہ صرف ان دو ادیان کے نام لیوا ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے بلکہ خود ہر ایک کا دین ہفتاد و دو ملت میں بٹ کر داخلی مخاصمت کا ذریعہ بن گیا۔ ذرا ذرا سے فروعی اختلافات پر ایک دوسرے کا مقاطعہ بلکہ قتال جائز اور فرض بن گیا۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی کے دورِ عقلیت میں، جسے عقل کے پرستار دورِ تنویر کہتے ہیں تاکہ مذہبی ازمنۂ مظلمہ پر اس کی فوقیت ثابت ہو، اس عقیدے کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہ جماعتوں میں رواداری کا فقدان محض جہالت کا نتیجہ ہے عقل اور سائنس کی ترقی سے اس جہالت اور تعصب کا قلع قمع ہو جائے گا۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل تک یہ رجائیت قائم تھی اور فرنگ اپنی تہذیب اور انسان دوستی پر فخر کرنے لگا تھا۔ یہ ایک دھوکا تھا کیونکہ بعد میں آنے والی عالمگیر تباہی کے جراثیم اس دورِ تنویر میں پرورش پا رہے تھے۔ یورپ میں وطن پرستی اور قوم پرستی نے اس دور میں زور پکڑا۔ اس زمانے میں فرنگ کی مختلف اقوام نے دنیا کے ایک ایک کونے میں سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل کر لیا۔ یورپ کی مادی ترقی میں جو فروغ اور جاہ و جلال پیدا ہوا وہ کمزور اقوام کی محنت اور دولت پر چھاپہ مارنے کا رہینِ منت تھا۔ ہالینڈ اور بلجیم جیسی چھوٹی چھوٹی فرنگی اقوام نے دنیا کے وسیع اور زرخیز حصوں پر قبضہ کر لیا اور اپنے نفس کو یہ دھوکا دیا کہ خدا نے تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کے فرض کا بارِ عظیم گوری قوموں کے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔ اور ہم کمال ایثار سے ہر جگہ اس فرض کو ادا کر رہے ہیں۔ اس قسم کی ریاکاری اور دھوکا ہمیشہ قومی نفسیات کا

ایک لازمی عنصر رہا ہے۔

دنیا میں اعلیٰ تہذیب و تمدن پھیلانے کے یہ مدعی مال غنیمت کی تقسیم میں آپس میں لڑ گئے۔ لیکن ریاکاری خود فریبی اور عالم فریبی کی حد یہ ہے کہ ان عالمگیر جنگوں میں بھی جو کمزور اقوام پر قبضہ جمانے یا پہلے قبضے کو قائم رکھنے لئے کی گئی تھیں بڑے زور شور سے یہ اعلان ہوتا رہا کہ یہ جنگیں مساوات اور جمہوریت کی خاطر لڑی جا رہی ہیں تاکہ آئندہ کوئی قوم دوسری قوم پر اس کی مرضی کے بغیر حکومت نہ کر سکے۔ لیکن پہلی جنگ کے ختم ہونے پر فتح یاب ڈاکو دنیا کی جدید تقسیم میں لگ گئے۔ مگر اب تسلط اور استحصال بالجبر کیلئے نئی اصطلاحیں وضع ہو گئیں۔ عقلی جو دین کی قائم مقام بنی تھی وہ بھی دین سے کم ظالم ثابت نہ ہوئی۔ ان اقوام کے اندر سرمایہ اور محنت کی پیکار اور تیز ہو گئی۔

صلح اور عدل کے قیام کے لئے جمہوریت سے بہت سی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ بھی پوری نہ ہوئیں۔ اس لئے کہ مغرب میں جمہوریت کی اساس ہی طبقات کی پیکار رہی۔ انگلستان میں شاہ جون سے جو میگنا کارٹا۔ آزادی کا بڑا اجارہ حاصل کیا گیا تھا وہ بھی شاہی اقتدار کے خلاف جاگیردار امرا کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ اس میں رعایا کے اور عوام کے حقوق کا کوئی سوال نہ تھا۔ گزشتہ سو سال میں بنیادی انسانی حقوق کا تقاضائے سرمایہ داروں کا تقاضا تھا۔ وہ جاگیرداروں کے خلاف تجارت اور صنعت و حرفت سے سرمایہ اندوزی کے راستے میں سے رکاوٹیں رفع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عوام کو یہ دھوکا دیا کہ سب کچھ برادری برابری اور عام آزادی کی خاطر ہو رہا ہے۔ محنت کش عوام پر جب اس دھوکے کا پول کھل گیا تو سرمایہ اور مزدوروں کی کشاکش بڑھتی گئی۔

دین اور عقلیت جماعتوں اور طبقوں کی نفسیات اور اخلاقیات میں کوئی اہم تبدیلی پیدا کرنے میں ناکام رہے تو امیدوں نے جمہوری نظام کو نظرگاہ بنایا۔ آئیں دیکھیں کہ اس جمہوری نظام کی اخلاقیات کیا ہے۔ جمہوری نظام ہر ملک میں ایک انداز کا نہیں۔ اشتراکی روس بھی جمہوریت کا مدعی ہے اور انگلستان بھی۔ اشتراکی روس میں ان سرمایہ داروں اور محنت کشوں کے طبقے برسر پیکار نہیں کیونکہ اب سرمایہ دار وہاں صرف مملکت ہے۔ امیر و غریب کا فرق وہاں بھی موجود ہے لیکن زیادہ اجرت حاصل کرنیوالوں کا کوئی ایک معین اور منظم طبقہ نہیں۔ لیکن طبقات وہاں بھی موجود ہیں۔ تمام اقتدار اشتراکی پارٹی کے ہاتھوں میں ہے اور کوئی شخص جو اس پارٹی کا رکن نہ ہو اسے کوئی بلند مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ تمام قوم کے مقابلے میں یہ پارٹی ایک اقلیت ہے۔ لیکن یہ اقلیت تمام اکثریت پر حاوی اور محیط ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر وہاں کوئی پتا نہیں ہل سکتا۔ اس پارٹی کے خلاف کسی دوسری پارٹی کا قیام ناممکن ہے انگریز یا امریکی ایسی جمہوریت کو جمہوریت نہیں بلکہ آمریت کہتا ہے۔ انگریزی اور امریکی جمہوریت میں آرا کی کثرت کے حصول سے اکثریت حکمرانی کرتی ہے۔

انگریز کہتا ہے کہ پارلیمانی نظام میں دو پارٹیوں کا ہونا آزادی کا ضامن ہے۔ لیکن اس نظام کی اخلاقیات یہ ہے کہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے ووٹوں کی کثرت حاصل کی جائے۔ جب ایک پارٹی حکمرانی کی گدی پر بیٹھ جاتی ہے تو دوسری پارٹی کا لائحہ عمل یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہر طرح بدنام کیا جائے۔ اس کا اصل اصول ہی مخالفت ہوتا ہے۔ لارڈ کرزن نے اپنی

وائسرائلٹی کے زمانے میں ایک تقریر میں کہہ دیا کہ ہندوستانی بہت جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس پر مشہور انگریزی ادیب چیسٹرٹن نے کہا۔ کہ ہندوستان شاید غیر معمولی طور پر جھوٹ کی مسموم فضا سے لبریز ہوگا۔ کہ کرزن جیسے پالیٹیشن کا بھی وہاں دم گھٹنے لگا کیونکہ پارٹی پالیٹکس کا دارومدار خود دروغ پر ہے۔ ایک مفکر نے سچ کہا ہے کہ سیاست ایک زہریلا پیشہ ہے۔ اس لئے ہر سیاست پیشہ انسان کے نفس و اخلاق میں اس کا زہر کم و بیش ضرور سرایت کرتا ہے۔

انانیت فرد میں بھی ہوتی ہے اور جماعت میں بھی افراد کی خود غرضیاں ایک ہی جماعت اور ملت کے اندر کافی اختلال پیدا کرتی ہیں لیکن کچھ پاکیزہ نفس افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو عدل یا رحم کے جذبے سے دوسرے کے مفاد کا ایسا ہی خیال کرتے ہیں جیسے اپنے مفاد کا۔ بلکہ بعض اوقات اپنے مفاد کو دوسروں کی بھلائی کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے اخلاق کی توقع کسی جماعت، کسی قوم، کسی طبقے سے نہیں رکھنی چاہیئے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ از روئے نفسیات، اجتماعی اخلاقیات، انفرادی اخلاقیات کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ تنگ اور پست ہوتی ہے۔ آج تک کسی قوم یا کسی طبقے نے کسی دوسری قوم یا طبقے کے لئے رحم تو درکنار عدل سے بھی کام نہیں لیا۔ ان کے باہمی تعلقات کا مدار طاقت کے تناسب پر ہوتا ہے۔ جمہوریت میں بھی اقلیت اکثریت کو عادل نہیں سمجھتی۔ اس لئے اکثریت کے وضع کردہ قوانین کی پیروی مصلحت سے کرتی ہے نہ کہ عقیدت سے جب تک قوت میں کمی ہے تب تک لازماً سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

مختلف پارٹیاں حصولِ قوت کی کوشش میں لگی رہتی ہیں کیونکہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ دوسروں سے عدل کی توقع ایک امید موہوم ہے۔ اور فقط قوت ہی سے جائز و ناجائز حقوق حاصل ہو سکتے ہیں ہر ملت دوسری ملت کو جلی یا خفی دشمن سمجھتی ہے۔ جب کبھی ملتوں میں صلح بھی دکھائی دیتی ہے تو وہ کوئی مستحکم چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ ہنگامی طور پر حالات کی پیداوار ہوتی ہے کہ ایک ملت دوسری سے اتنی قوی نہیں کہ اس کے ساتھ جابرانہ سلوک روا رکھ سکے۔ یا دو اقوام میں مصالحت کی بنا دیگر اقوام کے مقابلے میں قوت میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ غرضیکہ ایسی صلح کی بنا بھی دشمنی ہی ہے۔ ایسی ہی صلح کو فارسی محاورہ میں گرگ آشتی کہتے ہیں۔ دو چار بھیڑیئے نہایت خاموش ایک دوسرے کے قریب بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی بھیڑیا دوسرے پر حملہ آور نہیں ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔ وہ بظاہر خفتہ دکھائی دیتے ہیں لیکن اندر سے خبردار ہوتے ہیں اور اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ ان میں کوئی اگر واقعی سو کر بے حس ہو جائے۔ تو اس کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔ اقوام کی ایسی ہی صلح کے متعلق حالی نے کہا ہے:۔

صلح ہے اک مہلتِ سامانِ جنگ
کہتے ہیں بھرنے کو یہ خالی تفنگ

قوم کی باہمی مخاصمت کی نفسیات کو سید احمد خاں علیہ الرحمتہ نے ایک انگریز افسر کے ایک سوال کے جواب میں نہایت اختصار سے بیان کر دیا۔ انگریز نے سید صاحب سے پوچھا کہ آپ کا عقیدہ اس بارے میں کیا ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔ سید صاحب نے کہا کہ اگر کر سکیں تو جائز ہے۔ لیکن اگر نہ کر سکیں تو حرام ہے۔ مطلب یہ تھا کہ تم مطمئن

رہو مسلمانوں کی موجودہ حالت میں تمہارے خلاف جہاد ناممکن ہے۔ اس لئے ناجائز ہے۔

انسانی جماعتیں مذہب کی بنا پر بنتی ہیں، یا معاشی مفاد کی بنا پر یا نسلی جذبے سے یا قومی جذبے سے۔ بنائے ملت سازی خواہ کچھ بھی ہو اس میں تنگ نظری، بے عدلی اور تعصب کا داخل ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

کوئی جماعت علی الاعلان اس بداخلاقی کا اقرار نہیں کرتی۔ اور ریاکارانہ استدلال سے اپنے آپ کو اور باقی دنیا کو دھوکا دینے کی کوشش کرتی ہے۔ کوئی جماعت کہتی ہے۔ کہ ہم خدا کی منتخب اور محبوب قوم ہیں ہمارے تفوق کا خدا ضامن ہے، ہم بداعمالیوں کے باوجود نجات کے اجارہ دار ہیں، از روئے وحی دوسری ملتوں کا فرض ہے کہ ہمارے مطیع و منقاد رہیں اگر وہ برابری کا دعوے کریں تو اُن کی سرکوبی کی جائے۔

ہندوؤں میں برہمنوں اور چھتریوں نے اسی طرح اپنے تفوق کو دھرم بنا کر پیش کیا۔ اور خدا کی کثیر مخلوق کو غلام اور اچھوت بنائے رکھا۔ بدھ مت نے ورن آشرم یعنی ذات پات کے نظام کو مٹانے کی تلقین کی۔ تو برہمنوں نے اس مت کے پیروؤں کو تمام ملک سے صفایا کر دیا۔ بدھ مت میں عدل سے بڑھ کر رحم کی تلقین تھی۔ اس کے پیروؤں نے ایک وسیع سلطنت حاصل کرنے پر بھی برہمنوں کے مفاد کے خلاف قوت کا استعمال نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتدار پسند اور قوت پرست غالب آگئے اور صوفی منش گروہ کو دیس نکالا مل گیا۔

اقبال نے کیا سچ کہا ہے

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

غالباً کرامول کا مقولہ ہے۔ کہ خدا پر بھروسہ کرو۔ لیکن ساتھ ہی اپنی بارود کو نم آلودہ نہ ہونے دو۔ اسلام نے بھی یہی کہا ہے۔ کہ خدا پر بھروسہ رکھو۔ لیکن اپنی جنگی تیاری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔ اگر تم میں قوت نہ رہی تو تمہاری عدل کوشی اور تمہاری رواداری کسی کام نہ آئے گی۔

کسی فرد کی اخلاقی حالت میں حقیقی تبدیلی اس وقت واقع ہوتی جب کہ اس کے نفس میں کوئی تغیر ہو کسی شخص کے نفس پر صالحانہ تبدیلی سے یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ عدل و رحم کا سلوک کرنے لگتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس اصول کا اطلاق اقوام پر بھی ہوتا ہے۔ کسی قوم کی حالت بھی نہیں بدل سکتی جب تک کہ اس کے نفس میں تغیّر پیدا نہ ہو۔

دین عالیہ، اخلاق فاضلہ، اچھی تعلیم و تربیت اور اچھی صحبت سے افراد کے نفوس میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن اجتماعی نفس زیادہ وحشیانہ نفس ہے۔ اس پر آج تک دین اور اخلاق کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ جب تک انسانوں کی نفسیات میں کوئی عظیم انقلاب پیدا نہ ہو۔ تب تک صورت حال یہی رہے گی کہ کچھ افراد تو خدا پرست اور خلق دوست ہوجائیں گے۔ لیکن مذہبی فرقے، معاشی طبقے، نسلی گروہ، قومیت پرست، وطن پرست، اخلاقی پستی ہی کی زندگی بسر کرینگے اور بین الملل روابط میں پوری صداقت، پورا انصاف اور پوری ہمدردی سے کام نہ لیں گے۔ لاکھوں برس سے استوار شدہ قبیلوی نفس جماعتوں کے اندر مختلف رویوں میں ظاہر ہوتا رہتا

ہے لیکن اس کی اصلیت نہیں بدلتی :-

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من انداز قدت را می شناسم

حقیقی موحد وہی ہیں جو وحدت انسانی کے لئے بھی کوشاں ہوں اس کے لئے کمال درجے کی عقل اور کمال درجے کے عشق کی ضرورت ہے۔ ابھی افراد ہی کو یہ کمال حاصل نہیں ہوا۔ خدا جانے اقوام کی نفسیات کو بدلنے کے لئے کتنا عرصہ اور کس قسم کی مسلسل جدوجہد درکار ہے۔ نوع انسان کے اندر ملتوں کا وجود تو شاید ابدالآباد تک قائم رہے لیکن انسانیت کو ابھی دیر تک اس تضاد کو رفع کرنے کا کام کرنا ہے۔ جو انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات میں پایا جاتا ہے۔ ملتوں کے باہمی روابط میں عدل و رحم کا جذبہ پیدا کرنا بہت دشوار اور بہت طویل کام ہے۔ جب ملتوں کی باہمی تنگ نظری مٹ جائے گی تو انسان صحیح معنوں میں موحد ہو گا۔ ملتوں کو مٹانے کی آرزو ان کے امتیازات کو مٹانے کی تمنا نہیں ہے بلکہ ان تعصبات اور اجتماعی انانیت کو رفع کرنے کی خواہش ہے۔ موحد وہی ہے جس کے اندر یہ خواہش موجود ہو۔ اور وہ حسب توفیق اس کو عمل کا جامہ پہنا لے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں (غالب)

حکمتِ رومی

مصنفہ

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

قیمت۔ تین روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور